دبستان لکھنؤ اور اردو صحافت

شمیم طارق

فلیٹ نمبر 27، 4th فلور، مرزبان منسن، بائیکولہ فروٹ مارکیٹ، ممبئی، موبائل: 9224751077

راقم الحروف ادب کے مختلف مراکز میں کسی قسم کی تفریق یا صف آرائی کا قائل نہیں ہے اس لیے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے شعری مزاج، ان کے امتیازات اور ان کے درمیان لہجے اور تذکیر و تانیث کے اختلاف کو الگ الگ افتادِ طبع اور لسانی وضع تسلیم کرنے کے باوجود ان کو ایک دوسرے کا حریف نہیں سمجھتا۔ دہلی اور لکھنؤ کے سیاسی سماجی معاشی حالات اور ان دونوں شہروں کے لوگوں کے مزاج کے جو اثرات وہاں کے تمدن پر مرتب ہوئے ان سے ان کا ادب بھی متاثر ہوا۔ کھڑی کے زیر اثر دہلی کی زبان اور برج اور کسی حد تک اودھی کے زیر اثر لکھنؤ کی زبان میں فرق پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں یا ان دونوں شہروں میں تخلیق ہونے والے ادب میں کوئی فرق نہیں تھا یا لکھنؤ کے دارالسلطنت بن جانے یا سراج الدین خاں آرزو، میر تقی میر اور کئی دوسرے شاعروں کے اس شہر کو اپنا مسکن بنا لینے کے بعد ''دبستان دہلی'' کے امتیازات باقی نہیں رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دبستان دہلی کے جو امتیازات پہلے تھے وہ لکھنؤ کے دارالسلطنت بننے اور یہاں کا شعری ماحول دہلی سے آ کر بس جانے والے شعرا کو راس آ جانے کے باوجود نہ صرف باقی رہے بلکہ وسیع تر علاقے میں مقبول بھی ہوئے۔ ہاں، نادر شاہ کے حملے، ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی اور ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے دہلی کی معاشی اور تمدنی زندگی جس طرح متاثر ہوئی اس طرح لکھنؤ کی زندگی متاثر نہیں ہوئی اگرچہ ۱۹۴۷ء کے بعد تقسیم اور زمینداری کے خاتمے کے اثرات یہاں بھی مرتب ہوئے۔ ان حالات میں دہلی کی زبان اور ادبی سرگرمیوں کا زیادہ متاثر ہونا فطری تھا، سو ہوا۔ اس کے باوجود راکھ کے نیچے جو چنگاریاں تھیں وہ ختم نہیں ہوئیں اور حکومت کی سرپرستی کے بغیر بھی دبستان دہلی کم از کم اپنے ہونے کا ثبوت دیتا رہا اور دہلی میں تخلیق ادب کا جو سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا لکھنؤ کے دارالسلطنت بن جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ داغ حیدرآباد چلے گئے، مگر ان کا یہ مصرعہ اردو زبان کے علاوہ ''دبستان دہلی' کی بھی شان بیان کرتا رہا:

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

دبستان دہلی میں حزن کی کیفیت غالب رہی اور دبستان لکھنؤ میں عیش و طرب کی کیفیت۔ ''رمز'' اور داخلیت دبستان دہلی کی خصوصیت تسلیم کی گئی، بیانیہ اور خارجیت دبستان لکھنؤ کی۔ دبستان دہلی میں غزل اور غزل میں فراق زدگی و ہجر نصیبی کو فروغ ہوا، شہر آشوب لکھے گئے تو، دبستان لکھنؤ کی غزل میں عیش و نشاط کی کیفیت کا اظہار ہوتا رہا۔ مرثیہ و مثنوی کی صنف کو مقبولیت ملی اور داستان گوئی کو بھی عروج حاصل ہوا۔ سید انشاءاللہ خاں انشاء کی یہ عبارت:

> ''محبوبان لکھنؤ کی زبان و پوشاک و حرکات کا معشوقان دہلی کی گفتگو و لباس اور اداؤں سے افضل ہونا بداہت کے ساتھ واضح ہے اس لیے کہ اہل لکھنؤ نے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور گفتگو کرنے نیز دوسری باتوں کا سلیقہ اپنے ماں باپ سے سیکھا ہے پس ان چیزوں میں مثل ان کے ہیں اور جو کچھ مثل نزاکتِ آواز و حسنِ کلام اور حرکات دلنشیں و وضع لباس انھوں نے خود ایجاد کیا ہے ان کے بزرگوں کی معلومات میں اضافہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں شاہجہان آباد سے زیادہ فصیح و بلیغ و لطیف لوگ آباد ہیں''[1]

اور غالب کا یہ خط:

> ''میر مہدی تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی ''میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے۔'' اہل دہلی یا اہل حرفہ ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا۔''[2]

اس دور کی تصویر کشی کرتا ہے جب دہلی خزاں رسیدہ ہو چکی تھی اور لکھنؤ پر بہار چھائی ہوئی تھی۔ انشاء اور غالب دونوں اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکے تھے کہ دہلی خزاں رسیدہ ہونے کے باوجود آمد بہار کے امکان سے اور لکھنؤ خوشحال اور نزاکت پسند ہونے کے باوجود زمانے کے تغیرات

سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

غالب کی تحریر میں اس دور کے مزاج کا بھی عکس ہے جو ''اشراف'' اور ''غیر اشراف'' کے درمیان تفریق کا قائل تھا۔ دہلوی اور پنجابی یا اہل زبان اور اہل حرفہ کہہ کر غالب نے جس ذہن کی ترجمانی کی ہے وہ ان کے تمام تر احترام کے باوجود قابل قبول نہیں ہے۔ اہل حرفہ اور پنجابیوں نے لہجے کے فرق کے باوجود اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس سے انکار اردو کو ایک خاص طبقے اور علاقے میں محدود کر دینے کے مترادف ہوگا اس سے اردو زبان و ادب کے بتدریج اور ہمہ جہت ارتقاء کی بھی نفی ہوگی۔ زبانیں جب ارتقا کے مراحل سے گزرتی ہیں اور ان کے بولنے والوں کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے تو اس قسم کے مسائل پیش آتے ہیں جن کی نشاندہی غالب نے کی ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انہی مراحل سے فصاحت کے دریا پھوٹتے ہیں۔ مثال کے طور پر یاد دہانی کی جاسکتی ہے کہ داغ دہلی کے تھے، مگر ان کی جانشینی پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کو ملی جو پنجاب کے تھے۔

غالب نے جو شکوہ میر مہدی سے کیا تھا، وہی شکوہ بعد میں لکھنؤ کے علی حیدر نظم طباطبائی نے بھی کیا:

''غیر قوموں کے خلط نے یہ اثر کیا کہ لہجہ تک بدل گیا۔ اب پنجاب کے لہجے میں اردو بولی جاتی ہے۔''[۳]

حسرت موہانی کو بھی اس سچائی کا علم تھا جس کا اظہار نظم طباطبائی نے کیا ہے مگر وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ اب پنجاب بھی اردو کا ایک اہم مرکز ہے اس لیے ایک طرف تو حالی کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

''بعض اخباروں کی رائے ہے کہ حالی کی زبان کی لغزشوں پر ان کی قومی خدمات کے لحاظ سے اعتراض نہیں کرنا چاہیے، لیکن مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ ہندوستان کا ایک حصہ بدقسمتی سے ان کی پیروی کو باعث فخر سمجھتا ہے اور جو کچھ خواجہ صاحب کے قلم سے نکلتا ہے اس کو صحیح قرار دیتا ہے، ایسی حالت میں اگر ان سے زبان کی کوئی غلطی سرزد ہو تو اس سے چشم پوشی کرنا گویا دیدہ و دانستہ ایک حصہ ملک کی زبان کو خراب کرنا ہے۔''[۴]

اور دوسری طرف اپنے رسالے میں ''اردو زبان پنجاب میں'' کے عنوان سے اقبال کے خلاف اپنے کسی دوست کا مضمون شائع کرتے ہوئے یہ نوٹ بھی لگایا:

''ہم کو سخن سنجانِ پنجاب کی دل شکنی کے خیال سے اس مضمون کے شائع کرنے میں کسی قدر تامل تھا، لیکن یہ دیکھ کر کہ صاحب مضمون نے زبان کی کمزوریوں سے گزر کر حضرت اقبال کے نفسِ شاعری پر مطلق اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ جا بجا تعریف کی ہے، ہم اس کی اشاعت جائز رکھتے ہیں امید ہے کہ اہلِ پنجاب کی انصاف پسند طبیعتوں کو یہ بیان ناگوار نہ گزرے گا۔''[۵]

اس نوٹ سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت پنجاب میں لکھی اور بولی جانے والی زبان کی اصلاح چاہتے تھے وہیں اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے تھے کہ پنجاب کے لوگ انصاف پسند ہیں اور پنجاب میں بھی اچھا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ خود اپنے رسالے میں انھوں نے جن کے مضامین شائع کیے تھے ان میں اقبال بھی شامل تھے۔ شرر اور چکبست کے معرکے میں بھی انھوں نے فریق کا کردار نہیں ادا کیا بلکہ ایک زباندان اور اردو کے عاشق کی حیثیت سے جہاں شرر سے اختلاف کیا وہیں چکبست کے بعض بیانات کو بھی مسترد کیا۔ راقم الحروف بھی ''دبستان دہلی'' اور ''دبستان لکھنؤ'' کو ایک دوسرے پر فوقیت دینے کی کوشش سے پیدا ہونے والی کشمکش کو اوج لکھنوی کا یہ شعر پڑھتے ہوئے مسترد کرتا ہے:

شہرت ہر ایک شہر میں اس گفتگو کی ہے
دہلی کا ہے مذاق زباں لکھنؤ کی ہے

واقعہ یہ ہے کہ بدلتے ہوئے سیاسی سماجی حالات میں لسانی تغیرات سے ہر زبان دوچار ہوتی ہے۔ علاقائی لہجہ بھی فطری ہے اس لیے صحت زبان کی یاد دہانی تو کی جاسکتی ہے علاقائی لہجے سے تنفر کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ حیدر آباد، لاہور، دہلی، لکھنؤ میں اردو بولنے والوں کا الگ الگ لہجہ اور انداز ہے، مگر تمام دبستان اور لہجے اردو ہی کے ہیں، ان شہروں یا دبستانوں میں بھی بہت خوبصورت زبان لکھی گئی ہے۔ کیا جوش اور عرش کی شاعری کے علاوہ چراغ حسن حسرت، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، گوپی چند نارنگ..... وغیرہ کی نثر کو فراموش کیا جاسکتا ہے؟ یہاں ایک مثال پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

''دوسری جنگ عظیم کے دوران چراغ حسن حسرت میجر کی حیثیت سے سنگاپور میں تھے وہاں انھوں نے Officer Mess کے ایک بیرے کے الوداعی سرٹیفکیٹ میں لکھا:

''سست۔ کام چور۔ گستاخ
مثبت پہلو یہ ہے کہ کھاتا اور سوتا خوب ہے۔''

چراغ حسن حسرت پنجابی تھے، مگر کیا ان کی مندرجہ بالا تحریر کی

فصاحت ومعنویت سے انکار کیا جاسکتا ہے؟اس حقیقت کا اعتراف لازم ہے کہ اہل دہلی کے لہجے کے مقابلے اہل لکھنؤ کا لہجہ نرم ہے کیوں کہ دہلی پر جب بار بار قیامت ٹوٹ رہی تھی لکھنؤ میں اطمینان وفراغت کی فضا قائم تھی۔ یہاں ایسے اصول وقواعد وضوابط متعین کیے گئے جس سے زبان اردو باقاعدہ اور بااصول زبان بنی۔لکھنؤ میں رکیک وغیر فصیح لفظوں کو چھانٹنے کا کام بھی ہوا اور زبان اردو لطیف ونفیس زبان کہلائی، مگر لکھنؤ میں ایسی آوازیں بھی شدت سے بلند ہوتی رہیں کہ صحت زبان کے سلسلے میں اہل لکھنؤ کو حرف آخر سمجھا جائے، وہ بھی شہر یا شہر کے ایک خاص طبقے کی زبان کو۔نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو دبستانوں کے درمیان نزاع پیدا ہوا اور دوسری طرف اس سے اردو ضرورت ومزاج کے ہر لفظ کو اپنے اندر سمیٹنے کے بجائے اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ بالآخر لکھنؤ کے ہی سید مسعود حسن رضوی ادیب کو بھی یاد دلانا پڑا:

''اردو کو آسان اور عام فہم بنانا ہر بہی خواہ اردو کا اہم فریضہ ہے۔ یہ زبان جتنی عام فہم ہوگی اس قدر اس ضرورت کو پورا کرے گی جس کے ماتحت یہ وجود میں آئی ہے اور جب تک یہ اس ضرورت کو پورا کرتی رہے گی اس وقت تک کوئی طاقت اس کو فنا نہیں کرسکتی۔''[۶]

زبان کے معیاری اور غیر معیاری یا فصیح اور غیر فصیح ہونے کے جس معیار پر دبستان لکھنؤ کو فضیلت دی گئی تھی اس معیار پر اب لکھنؤ کی زبان بھی پوری نہیں اترتی، مگر دبستان لکھنؤ کا وجود تو باقی ہے۔اس لیے راقم الحروف کا کہنا ہے کہ سیاسی، سماجی حالات تو ہر شہر اور ہر ملک کے بدلتے ہی رہتے ہیں، مگر اس تبدیلی کے سبب ان خصوصیات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو ان سے منسوب رہی ہیں لہٰذا دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ بلکہ ''دبستان حیدرآباد''، ''دبستان لاہور''، ''دبستان رامپور''، ''دبستان عظیم آباد'' وغیرہ بھی (اگر ان کو دبستان کا درجہ نہ دیا جائے تب بھی تہذیبی مرکز کی حیثیت سے تو ان کی شناخت مسلم ہے) نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ان کے امتیازات کا نہ صرف اعتراف کرنے کی بلکہ ان کو بچانے کی ضرورت ہے۔ راقم الحروف کی عمر کا بیشتر حصہ ممبئی میں گزرا ہے، مگر اس کی جائے پیدائش (بنارس) دہلی کے مقابلے لکھنؤ سے قریب ہے۔بچپن ہی سے وہ لکھنؤ آتا جاتا اور اہل علم کی مجلسوں میں شریک بھی ہوتا رہا ہے اس کے باوجود وہ یہ سمجھتا ہے کہ صحتمند نقطۂ نظر یہی ہوگا کہ دبستان دہلی، دبستان لکھنؤ یا کسی اور دبستان کے بارے میں فریق بن کر یا کسی فریق کے وکیل بن کر انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔تمام دبستان اپنی خصوصیات کے ساتھ اس اردو کے دبستان ہیں جو ہندوستان گیر زبان ہے اور لہجے کے فرق اور لفظوں کے تھوڑے سے تصرف کے ساتھ ہر خطے اور طبقے میں بولی جاتی ہے۔اختلافات کے باوجود ان دبستانوں میں اتحاد کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔مثال کے طور پر مؤنث ومذکر کے سلسلے میں ذہنی کشادگی کی مثال خود دبستان لکھنؤ میں موجود ہے مثلاً جلال لکھنوی نے ''قواعد المنتخب'' میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں علامتِ مصدر ''نا'' کو مؤنث کی خاطر ''نی'' نہیں بناتے۔جعفر علی خاں اثر نے نشاندہی کی کہ ناسخ، آتش، امیر اور خود جلال کے کلام میں مفعول کی رعایت سے ''نی'' کی مثالیں موجود ہیں۔[۷] آج کے دور میں اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا جاسکتا۔صحافتی زبان تو اور زیادہ سلاست وسادگی اور کشادہ قلبی کی متقاضی ہے۔لکھنؤ کی اردو صحافت نے ہر زمانے میں اس کا خیال رکھا ہے۔

لکھنؤ میں اردو صحافت کا آغاز نسبتاً دیر سے ہوا، دہلی کا پہلا اردو اخبار ''دہلی اردو اخبار'' ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔''لکھنؤ اخبار'' لکھنؤ کا پہلا اخبار تسلیم کیا جاتا ہے جو ۱۸۵۰ء کے آس پاس شائع ہونا شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے کچھ پہلے یا آس پاس ''مسلم لکھنؤ'' (۱۸۵۶ء) ''سحر سامری'' (۱۸۵۷ء) ''اودھ اخبار'' (۱۸۵۷) وغیرہ کی اشاعت شروع ہوئی اور ۱۸۵۷ء کے بعد تو ''اودھ گزٹ (۱۸۶۰ء)، ''ہندوستانی'' (۱۸۸۳ء) ''طلسم لکھنؤ'' (۱۸۶۵ء)، ''مسلم گزٹ''، ''اودھ پنچ'' (۱۸۷۷ء) ''دارالسلطنت (۱۸۸۱ء)، ''ہمدم'' (۱۹۱۶ء) جیسے کئی اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے۔ انجمن اسلام کی کریمی لائبریری میں اودھ اخبار، انوارالاخبار، کارنامہ، انڈین ریفارمر، ورناکلر ایڈوائزر، ادیب، آئینہ، مشیر قیصر، تمنائی کے انیسویں صدی کے کچھ شمارے محفوظ ہیں۔تنویر، قائد، عزائم، قومی آواز کی یاداب بھی زندہ ہے۔ انقلاب، راشٹریہ سہارا، آگ، اودھ نامہ، صحافت، قومی خبریں وغیرہ اب بھی شائع ہو رہے ہیں۔

رسائل میں دلگداز (۱۸۸۷ء) خدنگ نظر (۱۸۹۷ء)، صبح امید، نیا ادب، الفاظ، معیار، ادب، مبصر، خیاباں، نگار اور کچھ دوسرے رسائل لکھنؤ یا کسی قریبی شہر سے ہی شائع ہوئے۔اس فہرست میں 'الندوہ' اور 'سچ' کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو بعد میں صدق اور صدق جدید کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ تمام رسائل اردو کی ادبی صحافت کے بنیادگزار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں سے شائع ہونے والے کئی اور اردو اخبارات ورسائل کے نام گنوائے جاسکتے ہیں، ان کی سنہ اشاعت کی بھی تصحیح کی جاسکتی ہے، مگر یہاں نام گنوانا مقصود نہیں ہے، دبستان لکھنؤ کی صحافت کے مزاج اور

خصوصیات کا تعارف کروانا مقصود ہے۔ نام تو محض اس لیے لیے گئے ہیں کہ نام لیے بغیر ان کے عہد، مزاج و معیار اور خصوصیات کا تعارف ممکن نہیں ہے۔ ان اخبارات و رسائل سے وابستگی کا اظہار کرنے یا ان میں مسلسل لکھنے والوں کے ناموں پر نظر ہو تو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوتا کہ ان سے زبان و ادب کی بیشتر نامی گرامی شخصیتیں وابستہ رہیں۔ رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین، اکبرالہٰ آبادی، منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مولانا عبدالحلیم شرر، نوبت رائے نظر، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، سید جالب دہلوی، دوار کا پرشاد افق، منشی پریم چند، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، شوکت تھانوی، عبدالباری آسی یعنی آسمان ادب کے نہ جانے کتنے ستاروں نے دبستان لکھنؤ کو اپنی تابانی عطا کی۔ ایسی شخصیتوں کی جو ادب و صحافت کی جامع ہوں اتنی بڑی تعداد کسی اور شہر یا دبستان کی صحافت سے وابستہ نہیں رہی۔

''دبستان لکھنؤ'' کی صحافت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے اخبارات و رسائل نے مضامین کے موضوعات کو تنوع اور علمی معیار عطا کیا مثلاً اودھ اخبار نے اصلاحی مضامین کے علاوہ علمی ادبی مضامین شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ ''اودھ پنچ'' ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ جاتا تھا۔ انشا پردازی بہت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ بقول رام بابو سکسینہ ''یہ اخبار عوامی مسائل و معاملات میں اپنی رائے رکھتا تھا۔ قومی حقوق کا تحفظ کرتا تھا اور ہندوستانی رؤسا کا محتسب و ناصح تھا۔''[8]

ہندوستانی اخبار ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا۔ یہ پہلا اخبار تھا جو حالات حاضرہ اور سیاسیات پر مدلل بحث کرتا تھا۔ ''ہمدم'' آخری زمانے میں سب سے زیادہ معتبر اور مقبول اخبار تھا۔ رسائل میں دلگداز، خدنگ نظر، اردوئے معلیٰ، الفاظ، معمار، مبصر، ادب، خیاباں، نگار میں تو بیشتر اس کے مستحق ہیں کہ ان پر مستقل مضامین لکھے جائیں۔

لکھنؤ کی صحافت کی اس خوبی سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس نے صحافتی زبان کو ادبی زبان سے ہم آہنگ کر کے اس کو ایک خاص لذت و تاثیر عطا کی۔ یہ اعزاز بھی ''دبستان لکھنؤ'' کے اخبار ''تنویر'' کو ہی حاصل تھا کہ یہ ایک ہی شہر سے بیک وقت کئی پریس سے شائع ہوتا تھا اس کے باوجود سب کو نہیں ملتا تھا۔ پریس سے اخبار باہر آتے ہی لوگ جھپٹ پڑتے تھے۔ ''اودھ پنچ'' کی مقبولت کا بھی یہی عالم تھا۔ رتن ناتھ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' اودھ اخبار' میں شائع ہونا شروع ہوا تو اس کے خریداروں کی تعداد اور پڑھنے والوں کا اشتیاق اتنا بڑھ گیا کہ وہ پورے ہفتے اخبار کے منتظر رہتے تھے۔

لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تفصیلات و امتیازات کا کسی ایک مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں دبستان لکھنؤ کی صحافت کے چند امتیازات بیان کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اردو صحافت میں ''ہمیں سے محبت ہمیں سے لڑائی'' کا انداز سرسید احمد خاں نے شروع کیا تھا۔ اودھ اخبار نے اس انداز کو اتنی ترقی دی کہ C.A.Bayly نے اس کو

> Covert Criticism of British rule in Hindustan along the lines of old patriotism, but in the voice of unalloyed loyalism.[9]

قرار دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ''اودھ اخبار'' عوامی رائے کے بہانے حکومت کی پالیسیوں کے خلاف بھی مضامین شائع کرتا تھا حالانکہ اس اخبار کو حکمراں طبقے کے ہی ایما اور امداد سے جاری کیا گیا تھا۔ یہ روایت بعد میں بھی قائم رہی۔ ''قومی آواز'' کانگریس کا اخبار تھا، مگر کبھی کبھی کانگریسی حکومت سے اختلاف بھی کرتا تھا۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ سمپورنانند نے پنڈت نہرو سے شکایت بھی کی تھی کہ کانگریس کا اخبار ہو کر یہ میری حکومت پر تنقید کرتا ہے اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے جواب دیا تھا کہ یہ کانگریس کا اخبار ہے، حکومت کا اخبار نہیں ہے، دوسرے اخباروں کی طرح اس کو بھی تنقید کرنے کا حق ہے۔

۲۔ اردو صحافت میں طنز و مزاح کی بنیاد ''مذاق'' رام پور (۱۸۵۵ء)، ''مدراس پنچ''، مدراس، (۱۸۵۹ء)، ''فرحت الاحباب، ممبئی، (۱۸۷۶ء) ''روہیل کھنڈ پنچ'' مراد آباد (۱۸۷۶ء) اور کچھ دوسرے اخبار اور کچھ دوسرے اخبارات میں شائع ہونے والی تحریروں میں پڑ چکی تھی، مگر اردو صحافت میں طنز و مزاح کی روایت کو مستحکم کرنے کا سہرا اودھ پنچ (۱۹۷۷ء) کے سر ہے۔ اس اخبار کا بنیادی مقصد ہند اسلامی ثقافت کی تبلیغ، کانگریس کی حمایت اور بشمول بدیسی حکومت انگریزی تہذیب کی تنقیص تھا، مگر یہ علی گڑھ تحریک کا بھی مخالف تھا اور پھر اس کی تحریروں میں سطحیت اور پھکڑ پن ہوتا تھا اس لیے بقول چکبست ''قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے''[10] اس کے باوجود ''اودھ پنچ'' نے طنزیہ اور مزاحیہ تحریر یا کالم لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت تیار کی جن میں سے بعض نے اپنے اصل نام سے بعض نے نام کے ہر جز کے پہلے حرف کو نام کی جگہ استعمال کر کے اور بعض نے

قلمی ناموں سے ایسی تحریریں لکھیں جو عوام وخواص میں مقبول بھی ہوئیں اور جن سے صحافت میں ظریفانہ اسلوب کو استحکام بھی حاصل ہوا۔ مثلاً منشی سجاد حسین اور رتن ناتھ سرشار جنھوں نے کچھ عرصہ بعد ہی ''اودھ پنچ'' سے علیٰحدگی اختیار کر لی اپنے نام سے مضامین لکھتے تھے، مگر مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کے نام سے، احمد علی شوق الف ع شوق کے نام سے، تربھون ناتھ ت۔ن ہجر کے نام سے، نواب محمد خاں آزاد کے نام سے، جوالا پرشاد جب برق کے نام سے، احمد علی الف ع کے نام سے، مولوی فضل لاابالی کے نام سے اور سید مقبول حسین ظریف لکھنوی کے نام سے مضامین اور کالم لکھتے تھے جن میں مزاح کے انداز میں طنز کے تیر برسائے جاتے تھے۔

یہاں مثال کے طور پر ''اودھ پنچ'' سے احمد علی شوق کی ایک تحریر پیش کی جارہی ہے جس کی کاٹ ہر حساس شخص محسوس کر سکتا ہے:

''آخر یہ عشق ہے کون جانور، چرند ہے یا پرند، رہتا کس دیس میں ہے، کھاتا کیا ہے، پیتا کیا ہے، بس یہ ننھی سی رائی کے دانے کے برابر کی بات، جس کے واسطے کامل کی تلاش، کشف نہیں، کرامت نہیں، مراقبہ نہیں، سماج نہیں، حال و قال نہیں، مسئلہ تجدّد وامثال نہیں:

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی پوچھے ہم سے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

انشاء اللہ آپ ہیں اودھ پنچ کے نامہ نگار۔ چشم بددور آپ سے بڑھ کر اس معمے کا حل کرنے والا کون۔ علماء زاہد خشک، صوفی جاہل، پنڈت برائے نام، شعرا بے اعتبار، ایک آپ کی ذات ہے باقی اللہ اللہ خیر سلاّ، بندہ پرور سنئے اگلے زمانے والے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے سیدھے سادے آدمی تھے، جو جی میں آیا کہہ گزرے جو سنا مان لیا، نہ حجت نہ دلیل۔ یہ عقل جو اس زمانے والوں کو اللہ نے دی ہے پہلے اس کی چھاؤں بھی نہ تھی۔ نہ یہ طریقۂ تعلیم، نہ یہ تہذیب، نہ یہ اپج، نہ یہ ایجادیں، نہ یہ رفتار، نہ گفتار، نہ لباس، نہ قیاس، اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا اسی عشق کے معاملے میں دیکھ لیجیے متقدمین نے کیسی منھ کی کھائی، ہزار عقل کے گھوڑے بگ ٹٹ دوڑائے لیکن منزل مقصود کو نہ پہنچے۔ صرف دو قسمیں قائم کیں، ایک مجازی دوسری حقیقی، بھلا عشقِ بازاری، عشق خانگی، عشقِ ازدواجی، ان کا بھی کہیں ذکر ہے؟ خاک نہیں، اب آپ انصاف فرمائیے، لمبی چوڑی عقل والے ان کی تحقیق پر کیوں نہ حرف رکھیں۔ مجازی اور حقیقی کی تفصیل میری دانست میں فضول ہے۔ ان سے تمام پرانی کتابیں بھری پڑی ہیں، رہیں نو ایجاد قسمیں ان کا سمجھانا کون بڑی بات ہے، کون بڑی بات ہے، چٹکی بجاتے سمجھائے دیتا ہوں۔ عشق ایک قسم کا ولولہ ہے جو ایام شباب میں ظاہر ہوتا ہے اور جو ایک جنس کو رجوع کرتا ہے طرف دوسری کے۔ بازاری میں یائے نسبتی تصور فرمائیے۔ چونکہ عشق بازار سے متعلق ہے اس لحاظ سے بازاری نام رکھا گیا۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔.....''

اودھ پنچ کو کتنی مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ لاہور پنچ، جالندھر پنچ، پنجاب پنچ، سرپنچ، بنگال پنچ، باوا آدم پنچ، راجپوتانہ پنچ، بنارس پنچ، کرناٹک پنچ، کٹیہر پنچ، قنوج پنچ، آگرہ پنچ، فیروز پور پنچ، برار پنچ، جیسے درجنوں اخبارات شائع ہوئے جن کے نام میں پنچ شامل تھا۔ اس سے پہلے کسی اور شہر کے کسی اخبار کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی جہاں کے کسی اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم ہو کہ ایک اخبار کے نام پر درجنوں اخبار مختلف شہروں اور علاقوں سے شائع ہونے لگے ہوں۔

''اودھ پنچ'' کے نام پر درجنوں اخبار ہی نہیں نکلے اس کے مزاج اور انداز تحریر کی نقل کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ریاض خیرآبادی نے ''فتنہ'' کے نام سے ایک اخبار نکالنا شروع کیا جو بعد میں ''فتنہ عطر فتنہ'' کہلایا۔ اس کا ایک مضمون جو ''چغتائی'' نے لکھا تھا اور ''پہچانتے ہیں'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کا مستحق ہے کہ ملفوظات میں شامل کیا جائے۔

پہچانتے ہیں

کتے	کو	ہانڈی سے
تہذیب	کو	برانڈی سے
طوائف	کو	پیشواز سے
ملا	کو	جانماز سے
چوہے	کو	طاعون سے
گنجے	کو	ناخون سے
گھوڑے	کو	اگاڑی سے
مفلس	کو	تاڑی سے
افیونی	کو	پینک سے
کتاب	کو	دیمک سے
صبح	کو	شام سے

شام کو دلارام سے''

اسی طرح ''دور باش'' کے قلمی نام سے لکھی ہوئی یہ سطور بھی طنز و مزاح کے ساتھ معلومات کا خزانہ ہیں، عنوان ہے ''الحذر''

الحذر

بھوکے بنگالی سے کم سن سالی سے
کم وزن باٹ سے ٹوٹی ہوئی کھاٹ سے
تنگ بوٹ سے دن دوپہر کی لوٹ سے
اونچی دوکان سے پھیکے پکوان سے
گنواری بولی سے مفلس کی ہولی سے
پسّو اور کھٹمل سے ولایتی ململ سے
گھڑی کی کوک سے دوپہر کی بھوک سے
ملازم بدتمیز سے نادان عزیز سے
سڑک کی گرد سے دانت کے درد سے
ساجھے کی ہانڈی سے شملے کی ڈانڈی سے
صبح کے خمار سے شباب کے اتار سے
ناحق کی دلیل سے نئے وکیل سے
پھٹے ہوئے جوتے سے دوسرے کے بل بوتے سے''

۳۔ صحافتی زبان میں سلاست اور لفظوں کے استعمال میں عام اردو داں عوام کے مزاج کا لحاظ دبستان لکھنؤ کی صحافت کا امتیاز ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اور حیات اللہ انصاری میں زبان کے سلسلے میں جو بحث ہوئی تھی اس کا ماحصل یہ تھا کہ اخباری زبان سادہ اور صاف ستھری ہو، انھوں نے صحافتی زبان سے نامانوس تراکیب اور اضافتیں ختم کیں، لفاظی اور عبارت آرائی سے گریز کیا۔ ''بین الاقوامی'' کے بجائے ''بین اقوامی'' لکھنا شروع کیا اواس طرح تقریباً ۲۵۰ لفظوں کو نئے قالب میں ڈھالا۔ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کیے۔ اس سے پہلے وہ ''ہندوستان'' سے واؤ حذف کر چکے تھے جس پر واویلا ہوا تھا۔ ہندوؤں نے احتجاج کیا تھا کہ واؤ حذف کر کے ہندوئیت پر ضرب لگائی گئی ہے اور مسلمانوں کو اعتراض تھا کہ اردو املا کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ القاب و آداب بھی ترک کر دیے تھے۔

مندرجہ بالا تین مثالوں سے دبستان لکھنؤ کے اخبارات و رسائل کے امتیازات واضح ہو جاتے ہیں۔ اس صحافت نے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور انھیں اصلاح پر آمادہ کرنے میں تو اہم کردار ادا کیا ہی اردو کو جدید اور ترقی یافتہ زبان ثابت کرنے اور اس زبان کو دوسری زبانوں کے لفظوں کو قبول کر کے سلیقے سے برتنے کی تحریک بھی دی، مگر اب صورت حال بدل رہی ہے۔ کیا دبستان لکھنؤ یا سرزمین لکھنؤ اور کیا دوسرے شہر سے شائع ہونے والے اخبارات سب کی زبان اصلاح کی محتاج ہے۔ اس لیے لکھنؤ کی موجودہ صحافت سے یہی گزارش کی جا سکتی ہے کہ وہ آج کی اردو صحافت کی زبان میں در آنے والی املا جملہ کی غلطیوں کو دور کرنے کا بیڑہ اٹھانے کے علاوہ اردو صحافت کی زبان کو اس کا وہ گم شدہ معیار اور سادگی کے باوجو صحت اور دادبی وقار عطا کرنے کی کوشش کرے جو دبستان لکھنؤ کا وطیرہ رہا ہے۔ کوئی دبستان اقبال گزشتہ کا قصیدہ پڑھ کر اپنے وقار کو باقی نہیں رکھ سکتا۔

حوالے:

۱۔ دریائے لطافت، ص:۱۰۹
۲۔ عود ہندی، ص:۱۴۱
۳۔ شرح دیوان غالب، ص:۱۶۱
۴۔ اردوئے معلّیٰ، اگست ۱۹۰۳ء، ص:۲۵
۵۔ ایضاً
۶۔ مطبوعہ خطبۂ صدارت، اورینٹل کانفرنس، ناگپور یونیورسٹی
۷۔ لکھنؤ کی زبان، شاعر، اکتوبر، ۱۹۵۱ء
۸۔ تاریخ ادب اردو، حصہ نثر، ص:۱۰۲
۹۔ An Empire of books by Ulrike Stark- 369
۱۰۔ طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی، ص:۱۸۸
۱۱۔ ''اودھ پنچ'' اور ''فتنہ عطر فتنہ'' کے اقتباسات، چنگاری کے کالم نگار نمبر (مرتبہ فکر تونسوی) دہلی، ۱۹۸۴ء کے شکریے کے ساتھ نقل کیے گئے۔

○○

دہلی کے ممتاز صحافی

اس کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے وہ باکمال صحافی جنھوں نے اپنی فکر و دانش سے ملک کے نظام کی سمت و رفتار متعین کی اور ایسے زمانے میں اس فن سے وابستہ رہے جب کہ یہ صرف گھاٹے کا سودا تھا لیکن ان سرکردہ صحافیوں نے اپنے اصولوں سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔

ان اکابرین کی سوانح اور کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے یہ کتاب ایک دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اکادمی کی کوشش ہے کہ ان لوگوں کے حالاتِ زندگی سے ہماری نوجوان نسل واقف ہو سکے نیز ان کے اصول و ضوابط، ان کی میانہ روی سے سبق حاصل کر سکے۔

مصنف: سہیل انجم صفحات: ۲۳۶، قیمت: ۱۵۰ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی